شہاب صفدر
اسکالر پی ایچ۔ڈی اردو، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد
ڈاکٹر ارشد محمود ناشاد
استاد، شعبہ اُردو، علّامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی، اسلام آباد

احمد ندیم قاسمی کی غزل کا رنگ و آہنگ

Shahab Safdar
Scholar Ph.D Urdu, Allama Iqbal Open University, Islamabad
Dr. Arshad Mahmood Nashad
Associate Professor, Department of Urdu Allama Iqbal Open University, Islamabad.

Ahmed Nadeem Qasimi's Ghazal Colour and Harmony

Ahmed Nadeem Qasmi is one of the most important creators in Urdu poetry after Iqbal. He acquired importance as a poet of ghazal and especially among progressive poets, like Faiz Ahmed Faiz, left no stone unturned to promote ghazal along with nazm. That is why the study of his ghazals is very important and determining his distinctive identity among contemporaries will guide the students of literature.

Key Words: *Creator, Urdu Poetry, Acquired, Ghazal, Progressive, Poet.*

احمد ندیم قاسمی اُردو ادب کی ایک ہمہ جہت اور متنوع صفات شخصیت کا نام ہے، جنھوں نے افسانہ، شاعری، ادبی صحافت، تنقید اور دوسرے کئی شعبوں میں اپنی گراں قیمت نگارشات سے کئی اضافے کیے۔ شاعری کی متعدد اصناف جیسے: نظم، قطعہ، غزل، نعت وغیرہ میں انھوں نے کلام کہا ہے اور ہر صنف کے تقاضوں اور امتیازات کو انھوں نے نئے رنگوں سے مستنیر کیا ہے۔ ندیم کی غزلوں کا موضوعاتی مطالعہ کیا جائے تو زندگی کے سارے رنگ اس میں بکھرے نظر آتے ہیں۔ ندیم کی غزلوں میں انسانی اقدار اور رشتوں کی ایک کہکشاں ہے۔ وہ وفا کی نایابی اور خلوص کے کم ہونے کے شکوہ کناں ہیں۔ کھوکھلا سماج اس کے لیے ایک بے معنی اور بے مغز ڈھانچہ ہے وہ تیرگی کو پھیلتا دیکھتے ہیں اور گجر بجنے سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ اگرچہ اس دھوکے کا ایک پہلو سیاسی ہے تاہم ایک معاشرتی بھی ہے۔ انہیں بہت قریبی رشتوں سے محبت کی آنچ آنے کی بجائے نفرت کے شعلے اٹھتے محسوس ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہ شہری زندگی میں گم ہو گئے ہیں لیکن انھیں اپنا دیہی سماج اور وہاں کے بے لوث کردار بھولے نہیں ہیں۔ ان کو شہر کی بظاہر خوش حال لیکن اندر سے نا آسودہ زندگی بے چین رکھتی ہے۔ ان کے نزدیک معاشرے کا زوال دراصل ان

پرانی قدروں کے گم ہو جانے کے سبب ہوا ہے جن کے وہ نوحہ گر ہیں۔ اس کا ایک سبب خارجی بھی ہے کہ بیسویں صدی کے انسان کو دو عالمی جنگوں نے توڑ کے رکھ دیا۔ اس لیے نفسا نفسی اور مفاد پرستی کا گھن معاشرے کو لگ گیا۔ ادب میں اخلاقی درس یا واقعاتی بیان ایک کمزوری ہے لیکن حالات و واقعات میں شدت ہو تو غزل میں ان کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔ اس لیے جنگوں کے بعد کی صورت حال نے غزل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ندیم کی غزل پر بھی اس کے واضع اثرات ہیں۔ تاہم ندیم کے ہاں ایک خاص قسم کی امید اور رجائیت ہے جو قاری کو مایوسی سے بچا لیتی ہے۔ ان کے غم ایک عذاب نہیں بلکہ خدا کی رحمت ہیں۔ وہ دشمنوں کے لیے بھی محبت ہیں۔ اس لیے ان کی شکست بھی انہیں اندر سے نہیں توڑتی۔ وہ جب آئینہ زندگی میں جھانکتے ہیں تو انہیں انسان نقشِ حیرت نظر آتے ہیں۔ جب ان پہ نشیب و فراز نمایاں ہوتے ہیں تو عقل و فکر کی پرواز رک جاتی ہے۔ شاہد آگہی کی دراز زلف انہیں خم بہ خم پھیلتی نظر آتی ہے۔ موہوم آغاز کا انجام بھی انہیں تاریک لگتا ہے۔ ساقی کے آستانہ عالم پناہ میں وہ اپنی تشنگی کو چھپائے بیٹھے ہیں۔ یار کی نیچی نگاہ کی جنبشوں سے انہیں عرش و فرش میں قیامتیں اٹھتی محسوس ہوتی ہیں۔ محبوب کے ظہور سے تنکوں میں غرور کی نمود دیکھنا انہی کا کام ہے۔ کسی کی قربت انہیں ہر چیز سے دور کر دیتی ہے۔ اسیر ان غم نصیب ساری چوٹیں اس لیے سہہ جاتے ہیں کہ انہیں کسی کے کرم پر بھروسہ ہے۔ انھیں انسانوں کے سیلِ حیات میں بہنے اور اہل ہوس کے پی کر چلے جانے کا دکھ بھی ہے لیکن وہ جس دست ناز کے جلوے میں محو ہیں وہ ان کی توجہ دوسری طرف نہیں ہونے دیتا۔ ادھر ان کی آنکھوں سے اشک ٹپکتے ہیں اور گردوں پر ستارے ٹوٹتے چلے جاتے ہیں۔ اصل میں ان نظر میں بہت دور کی منزل ہے اس لیے منزل پر پہنچ کر بھی وہ آگے سدھار جاتے ہیں۔ جب کوئی بھٹکا ہوا منزل کو پکارتا ہے تو انہیں راتوں کی آواز دل سے اٹھتی ہوئی لگتی ہے۔ وہ بظاہر محبوب کے تغافل کے گلہ مند بھی ہوتے ہیں۔ لیکن دم پھر بھی اس کا بھرتے ہیں۔ تغافل کے باوجود وہ اس کے لیے گلہ کٹانے تک کو تیار ہیں۔ ڈوب ڈوب کر بھی اسی کا نام لے کر ابھرنا ان کا شیوہ ہے۔ وہ اپنی روح کی گہرائیوں میں لرزہ خیز اسرار دیکھ کر لرز بھی جاتے ہیں۔ لیکن کسی کی نیم نگاہی ان کے جگر میں پیوست بھی ہے۔ جب وہ محبوب کی نگاہ میں اور محبوب ان کی نگاہ میں ہوتا ہے تو وقت کے قدموں میں تحیر کی زنجیر پڑ جاتی ہے۔ اسے حسن بشر میں جب خالق کی جھلک نظر آتی ہے تو وہ دعا بھی کر لیتا ہے۔ اسے اپنا دکھ محبوب کی رضا کا غلام لگتا ہے اس کے ہاتھ سے پونچھا ہوا اشک بھی ان کے لیے قیمتی ہے۔ جب ہر طرف انہیں اپنا آپ نظر آتا ہے تو انھیں حوصلہ امتحان نہیں رہتا۔ کون و مکاں کی حدوں سے دور پہنچ کر محبوب کے خدوخال بھی گم ہونے لگتے ہیں۔ نظارہ جمال کی تابانیاں انہیں کہیں اور لے جاتی ہیں۔ اس لیے تو ان کے

لبوں پر غلغلہ الاماں نہیں ہوتا۔ ندیم کی نگاہ میں آئینہ بہار گریبان خزاں سے مختلف نہیں۔ وفا کی لذت بے کیف انھیں جمود حیات لگتی ہے اس لیے وہ جفا طلبی کو اپنا شعار بناتے ہیں۔ اگر وہ کلبۂ غم میں آجائے تو اسے وہ نسیم سحری کے بھٹکے ہوئے جھونکے سے تعبیر کرتے ہیں۔ پردہ ارض و سما کے تکلف سے انہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کہکشاں انہیں غبار راہ محسوس ہوتی ہے اور وہ بشریت کی بلندیوں کو اس سے اوپر دیکھتے ہیں۔ اگرچہ ان کے دل کی بستی میں کوئی نہیں آتا لیکن پھر بھی امیدوں کے چراغوں نے راہ گزار کو روشن کیا ہوا ہے۔ ان کی اولین مڈبھیڑ کو زمانہ ہو چکا تاہم محبوب کی نظروں کی پکار ابھی تک ان کے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔ اسی لیے تو وہ خزاں سے بہار کی خبر پوچھتے ہیں۔ اور گلستاں سے دامن جھاڑ کر کسی نو بہار ناز کی نکہتوں کی خیر منانے نکل پڑتے ہیں۔ اسی لیے جب ان کی نگاہ سے کوئی پردہ سرکاتا ہے تو ان کی جبین شوق کو بھر سے سجدوں کا خیال آنے لگتا ہے۔ وہ خوش ہیں کہ ان کے دل کا آخری قطرہ کسی کے لیے حنا کا کام دے گیا۔ اسے بام انجم سے کوئی اشارے کرتا ہے اور اس کے سامنے مٹتی ہوئی کرنوں کے نقش ابھارتا ہے۔ انھیں عین طوفان میں کشتی زیست کنارے لگتی محسوس ہوتی ہے تو ایک ہی سہارے کا خیال آتا ہے۔ وہ کبھی کبھی خدا سے اس طرح بھی دست بہ دعا ہوتا ہے کہ اسے مکمل داستان سنانے کے لیے ایک اور زندگی درکار ہے۔ اس پر زندگی کی گتھیاں جتنی کھلتی ہیں اتنی پر اسرار ہوتی جاتی ہیں۔ دراصل خوب اور زشت کے شعور میں انسان کھو کے رہ جاتا ہے۔ اس لیے عشق کی تنہا بھول سے اپنی ذات کی گواہی لینا پڑتی ہے۔

ندیم کی غزل کا افق وسیع ہے وہ نہ کسی ایک موضوع تک محدود ہیں اور نہ ان کے ہاں کوئی خاص الفاظ کی تکرار ہے۔ نہ وہ ناصح ہیں اور نہ وہ نوحہ گر۔ ندیم ایک فنکار ہے اُس کی غزل اُس کے فن کا ایک دلکش جزو ہے۔ لیکن اس جزو میں کل کی نمود ہے۔ اُس کا تاریخی، سماجی اور معاشرتی شعور غزل کو صرف دو محبت کرنے والوں کی ہم کلامی سے بڑھا کر نسلوں کی فکری ہم آہنگی سے جوڑ دیتا ہے۔ اس لیے اُس کے ایک ایک مصرعے سے جو بات مترشح ہوتی ہے وہ یہ کہ شاعر ذات کی بجائے کائنات اور ذاتی، شخصی پہلوؤں کی بجائے اجتماعی حالات، واقعات پر گہری نظر رکھتا ہے۔ اسی طرح جان بوجھ کر لفظی و تراکیبی کاوشوں سے خود کو منفرد بنانے کی بجائے وہ جدت و انفرادیت طرزِ فکر و اظہار سے اجاگر ہونے پر یقین رکھتا ہے۔

جب اس تناظر میں ہم دیکھتے ہیں تو احمد ندیم قاسمی بطور غزل گو اردو شعری روایت میں الگ سے پہچانے جانے کا تقاضا کرتے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے شعر مشہور ہوئے اور عوام و خواص سے بیک وقت داد وصول کی۔ یہ اپنی جگہ خوبی سہی تاہم اگر ان کی غزل کا مجموعی جائزہ لیا جائے تو ایک نظام فکر شروع سے آخر تک جو ان کے اشعار

میں جھلکتا ہے وہ کہیں بھی ماند نہیں پڑتا۔ اگرچہ ان کی شعری زندگی کے آغاز میں کبھی اقبال، کبھی جوش کبھی فراق کبھی ناصر کاظمی تک کے اسالیب کی چھاپ کا الزام لگایا گیا لیکن دیانت داری سے دیکھا جائے تو ندیم کا شعری نظامِ فکر ان سب سے مختلف اور جدا ہے ایک عہد میں بلند ہونے والی بہت سی آوازیں کبھی کبھی ایک لے اور ایک سُر کی حامل لگتی ہیں جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا سرسری جائزہ لینے والے یکسانیت کا شُبہ ظاہر کرتے ہیں یکسانیت کا شُبہ تو ندیم پر دیگر ترقی پسند شعراء کے مطالعے کے دوران میں نہیں ہوتا جن کا مقصد و مطمح ایک تھا۔

فیض اور ندیم ترقی پسند غزل گوؤں میں دو اپنے رنگ کے نہایت مختلف اور منفرد معاصر ہیں باقی شعراء کا نام ان کے بعد آتا ہے۔ لہٰذا ندیم کے فکری نظام کو سمجھنا بہت ضروری ہے تاکہ ان کی غزل گوئی کے مجموعی مزاج کو سمجھا جا سکے۔ اس لیے ڈاکٹر ناہید قاسمی کا یہ مطالبہ مبنی بر صداقت نظر آتا ہے کہ ندیم کی غزل کو اسی تناظر میں دیکھا جانا چاہیے:

> "اپنے ہم عصر شعرا پر ندیم کو کئی لحاظ سے برتری حاصل ہے، لیکن سب سے اہم عنصر ندیم کا مرتب کردہ منفرد اور مضبوط نظام فکر ہے۔ وہ ہمیشہ ایک روشن فکر کو سامنے لائے ہیں۔"(۱)

احمد ندیم قاسمی کی غزل پر گفتگو کرتے ہوئے اس نکتے کو ملحوظ رکھنا بہت ضروری ہے کہ ایک مسلمان ترقی پسند غزل گو جو اپنے عقیدے سے انحراف کا مرتکب بھی نہیں ہوتا اور نئی روشنی سے محض اس لیے آنکھیں بھی نہیں چُراتا کہ کورانہ تقلید کے پابند اُس کے ہم مکتب اسے فتنہ قرار دیتے ہیں بلکہ وہ ایک توازن و اعتدال کے ساتھ ہر چیز کا تجزیہ خالص اپنے انداز اور زاویے سے کرتا ہے۔ وہ اپنے معاصرین سے اس حوالے سے کتنا مختلف ہے اس طرف بھی ڈاکٹر ناہید قاسمی نے اشارہ کیا ہے:

> "ندیم "ندیم کے ہم عصر غزل گو شعرا میں ناصر کاظمی نے میر کے پر سُوز انداز کو نیا رنگ دے کر اس کے ذریعے اپنے زمانے کے منفرد احساسات کو بیان کیا۔ فیض نے غالب اور اقبال کے مخصوص فارسیانہ طرزِ اظہار میں اپنے خیالات و احساسات کو شامل کر کے ایک نیا شیریں شاعرانہ لہجہ متعارف کروایا جب کہ ندیم نے پختہ لہجے کی بے ساختگی کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے منفرد اور روشن نظام فکر و فلسفہ کو اعتماد سے واضح سادہ اور موثر انداز میں سچائی اور بے تکلفی کے ساتھ پیش کیا"۔(۲)

ندیم کی غزل میں نظام فکر و فلسفہ کا جائزہ لیں تو بات تصورِ خدا سے شروع کرنی پڑے گی کہ اردو غزل کی روایت میں بھی یہ تصور بنیادی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ پھر یہ کہ ہر شاعر کے افکار و خیالات اور معاشرتی تہذیبی جذباتی رویّوں کا براہِ راست تعلق اُس کے تصورِ حقیقت سے جڑا ہوا ہوتا ہے ایک مؤحد کا زندگی اور کائنات کے بارے میں نظریہ کسی ملحد اور مشرک سے یقیناً مختلف ہو گا۔ احمد ندیم قاسمی کی غزل میں اُس کی توحید پرستی کا انعکاس بھی ہو گا اور زمین کے دیگر خود ساختہ خداؤں سے الجھنے کا رویہ بھی نمایاں ہونا چاہیے۔

اسلام کی الٰہیاتی فکر کو ماننے والا شاعر وحدت الوجودی افکار سے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا حضرت محی الدین ابن العربی کی فکر سے صوفیا کرام نے بالخصوص زیادہ اثر قبول کیا چوں کہ شعراء کا بیشتر طبقہ صوفیا کے مسلک کا پیروکار رہا ہے اس لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ یہ تصور ان کے فکری خمیر میں رچا بسا محسوس ہوتا ہے۔ محبت کا جذبہ غزل کا محرک و موضوع کل بھی تھا اور آج بھی ہے محبت جب انسان کے ذہن پر غالب آجاتی ہے تو اُسے سوائے رضائے محبوب کے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ یُوں ایک عام مسلمان شاعر کے ہاں بھی علیٰ کُلِ شیٍ قدیر کی ہستی مرکز و محور قرار پاتی ہے یہ درست ہے کہ بڑے شاعر کے ہاں ساتوں رنگ ایک روشنی میں ڈھلے محسوس ہوتے ہیں انہیں کسی منشور سے گزاریں تو اُن کی الگ الگ حیثیت پہچانی جا سکتی ہے تاہم وہ جس نقطے پر جمع ہوتے ہیں وہ تصورِ توحید ہے خدا کے ایک ہونے کی گواہی ندیم کے اشعار میں جگہ جگہ ملتی ہے۔ وہ ابتداء ہی میں خدا سے ہم کلام بھی ہوئے، اپنے وسوسوں اور خدشوں کا ظہار بھی کیا ہے، غالب کی طرح کہیں انھیں حرم و دیر آئینہ تکرار تمنا نظر آتے ہیں کہیں وہ محبوب کو سامنے پا کر تصورِ خدا میں گم ہو جاتے ہیں۔ کہیں وہ خدا کو حدِ کائنات سے ماوراڈھونڈتے ہیں اور کہیں کربِ محرومی سے مجبور ہو کر دستِ دعا اُٹھانے لگتے ہیں۔ اگر مختلف ادوار میں ندیم کے فن کا جائزہ لیا جائے تو "دھڑکنیں"(۱۹۴۱ع)"اور "رِم جھم"(۱۹۴۴ع) کو چھوڑ کر جو قطعات کے مجموعے ہیں۔ "جلال و جمال"(۱۹۴۷)"شعلۂ گل "(۱۹۵۳)" دشتِ وفا"(۱۹۶۴)"محیط"(۱۹۷۶)"دوام"(۱۹۸۰) "لوحِ خاک"(۱۹۸۹) 'بسیط' (۱۹۹۵)"ارض و سما"(۲۰۰۶) میں ان کا نظامِ فکر ارتقا پذیر ملتا ہے۔ آغاز میں "جلال و جمال" کا مرکب ہی اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ حسنِ حقیقی سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ انہیں دھول میں اُگے ہوئے پھول اسی خالق و مالک کا مظہر لگتے ہیں۔

یہ پھول بھی تو اسی دھول سے اُگے ہیں ندیمؔ
مرا خدا مری دنیا کا رہنے والا ہے (۳)

ندیم کے ہاں خدا کے بارے میں یہ تصور در اصل اُن کی اُردو غزل کی روایت سے جڑت کا نتیجہ ہے اگر ہم اس تصور کے پسِ منظر میں اردو غزل کی ابتدا پر نظر ڈالیں ہمیں اس کے ڈانڈے ولی دکنی کی شعری کائنات سے ملانے پڑتے ہیں ڈاکٹر سعد اللہ کلیم ولی کے ہاں تصورِ الٰہ کے موضوع پر لکھتے ہوئے وضاحت کرتے ہیں:

"وحدت اِلٰہ کی اور بھی کئی صورتیں ولی کی غزل میں ملتی ہیں۔ مثلاً اس کا تصورِ محبوب ایک ایسا مرکز ہے کہ اس کے حوالے ہی سے کسی اور چیز تک نظر جا سکتی ہے اس طرح کائنات کی ہر شے میں اس کو اپنے محبوب کا جلوہ نظر آتا ہے۔

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اُس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اُس کا
ہوا ہے مجھ پہ شمع بزم یک رنگی سے یو روشن
کہ ہر ذرے اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اُس کا" (۴)

تصورِ الٰہ کی یہ روایت سفر کرتے کرتے احمد ندیم قاسمی تک پہنچتی ہے۔ اس لیے اسے کائنات کا جلال و جمال اسی ازلی و ابدی جلال و جمال کا پرتو لگتا ہے۔ اس لیے اُسے قطرۂ شبنم آفتاب بدست محسوس ہوتا ہے اور فطرتِ بشری میں فاطر السموات والارض کی جھلک جلوہ نما دکھائی دیتی ہے۔

یہ ایک قطرۂ شبنم ہے آفتاب بدست
بہت قریب سے دیکھی ہے فطرتِ بشری (۵)

فروغِ ماہ میں تو اور شبِ سیاہ میں تو
بہر لباس نمایاں مری نگاہ میں تو(۶)

ذرّے ذرّے میں ترا عکس نظر آتا ہے
راستہ دیکھتے رہنا بھی اب آساں نہ رہا
پردۂ ارض و سما کا یہ تکلف کیسا
ان حجابوں میں تو جلوہ ترا پنہاں نہ رہا (۷)

جب تیرا ظہور دیکھتا ہوں
تنکوں میں غرور دیکھتا ہوں
جب سے میں قریب ہوں تمھارے
ہر چیز کو دور دیکھتا ہوں (۸)

"جلال و جمال" سے منتخب مندرجہ اشعار شاعر کی وحدت الوجودی فکر کا اظہار ہیں۔ یہ اشعار کہنے والا شاعر اپنی عمر کی تیسری دہائی میں قدم رکھ چکا تھا اس لیے ان میں گزشتہ شعراء سے افکار کی کہیں کہیں گونج محسوس ہوتی ہے بعض اوقات خدا سے مکالمے کا انداز فوراً اقبال کی یاد تازہ کر دیتا ہے

رہا جائے گا چپ کیسے خدا کے روبرو ہم سے
نہ کر محشر میں تسلیم و رضا کی گفتگو ہم سے (۹)

عمر کے ساتھ ساتھ شاعر کا فن پختہ ہو گیا اور تصور خدا یا براہ راست خالق کل کا بیان نہایت لطیف سانچے میں ڈھلتا چلا گیا "شعلۂ گل" جیسا کہ مجموعے کے نام سے ظاہر ہے شاعر کا فطرت سے سمبندھ گہرا ہو چلا ہے اور مظاہر فطرت کے پردے میں وہ اُس پیکر کو محسوس کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس کو بظاہر حواس خمسہ درک نہیں کر سکتے۔

بہار جب بھی چمن میں دیے جلاتی ہے
ہجومِ گل سے مجھے تیری آنچ آتی ہے (۱۰)

بن ہوا ابر ہو تیز ہوا ہو
تیرے حسن کا دیا جلایا ہو
وقت سحر یوں کلیاں چٹکیں
جیسے تیرا نام لیا ہو (۱۱)

خدا شناسی کا مرحلہ ندیم نے فطرت سے راز و نیاز کرتے ہوئے طے کیا پھر انسان کی اندرونی کائنات میں غوطہ زنی کی۔ اس لیے ڈاکٹر ناہید قاسمی ندیم کی غزل کا تجزیہ کرتے ہوئے انسان کی طرف شاعر کی توجہ مبذول ہونے کا دور بیسویں صدی کا وسط یعنی "شعلۂ گل" کی تخلیق کا زمانہ قرار دیتی ہیں:

"بیسوی صدی کے وسط سے ندیم کی توجہ اللہ کے شاہکار "انسان "کی طرف زیادہ مبذول ہوئی وہ اس شاہکار میں اس کے خالق کو ڈھونڈتے ہیں خالق کو دل کی گہرائیوں سے آواز دیتے ہیں اور اس کی توجہ حاصل کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں"۔ (۱۲)

اس لیے ندیم کی غزل میں آدمی یا انسان ایک ایسی عینک ہے جس سے وہ کائنات بھر کا مطالعہ کرتے ہیں ان کا تصورِ زمان و مکان آدمی کے ساتھ جڑا ہے اور وہ آدمی کو شش جہات کا دولھا قرار دیتے ہیں

آدمی شش جہات کا دولھا
وقت کی گردشیں براتی ہیں (۱۳)

اس لیے انسان کے حوالے سے وہ اپنا نظریۂ فن بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"میں انسان کو اور اس کی زندگی کو فن کا بنیادی موضوع قرار دیتا ہوں اگر انسان موجود ہے اور اس کُرے پر زندگی موجود ہے تو پھر سب کچھ موجود ہے انسان اور خدا ذات اور کائنات حقیقت اور مابعد الطبیعیات کے رشتوں پر بھی انسان اور زندگی کی موجودگی ہی میں غور کیا جا سکتا ہے سو میری نظر میں انسان اہم ہے۔ زندگی اہم ہے اور فن اسی صورت میں اہم ہے جب وہ انسان کو حسن و توازن حاصل کرنے میں مدد دے"(۱۴)

انسان دراصل خدا اور ابلیس کے درمیان حائل ایسی دیوار ہے جس نے خیر و شر کو آپس میں مدغم ہونے سے روکا ہوا ہے اس لیے یزدان و اہرمن کی جنگ میں انسان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یزدان شناسی سے یزداں دوستی تک کی منزلیں انسان کی معصوم خطاؤں سے پیار کر کے سر کی جا سکتی ہیں ندیم نے ایسا ہی کیا ہے لہذا اُس کا یہ کہنا اُس کے پختہ شعور اور انسان کے وسیلے سے خدا کی معرفت کا اظہار ہے۔

یزداں پہ جھپٹ پڑے گا ابلیس
انسان ہٹا جو درمیاں سے (۱۵)

انسان ندیم کی غزل کا ایک بڑا موضوع ہے اور اس کے کئی پہلو نہیں لیکن معرفت خدا کے سلسلے میں انسان اس کے ہاں ایک درمیان کی کڑی ہے گویا فطرت کے ساتھ ساتھ انسان کی تخلیق و تحریم نے اقبال کی طرح ندیم کو بھی خدا سے ہم کلام ہونے کا جواز فراہم کیا ہے اسی لیے بقول غلام محمد قاصر:

انسان کی اپنی اہمیت کے پیشِ نظر ندیم نے اپنی غزل
کے دامنِ تر پر آدم کی سلگتی ہوئی تاریخ لکھی ہے" (۱۶)
آدم کی سلگتی ہوئی تاریخ رقم ہے
جبریل کے شہپر سے مرے دامن تر تک (۱۷)

ندیم نے اقبال کی طرح خدا سے شکوے بھی کیے اور اپنی خطاؤں پر ندامت کا اظہار بھی کیا۔ لیکن دوست ہونے کے ناتے اُسے اپنا سچا غم گسار اور حقیقی محبوب و ہمنوا جانا ہے۔ ''دشتِ وفا'' میں ندیم خدا کی ذات سے جو امیدیں اور آرزوئیں وابستہ کرتا ہے وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ اس سچے اور آخری سہارے کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتا ہے۔

ہائے یہ مختصر حیات ہائے یہ اک طویل رات
اے مرے دوست اک نظر اے مرے چاند اک کرن (۱۸)
شیخ نے جس کو دیا نامۂ اعمال کا نام
ہم گنہگار اسے دامنِ تر کہتے ہیں (۱۹)
رات ٹوٹ پڑتی ہے جب سکوتِ زنداں پر
تم مرے خیالوں میں چھپ کے گنگناتے ہو (۲۰)
برسوں سے تری طرف رواں ہوں
ہمت ہے تو انتظار کر لے (۲۱)

اس شعر سے ذہن فوراً اقبال کی طرف جاتا ہے۔

باغِ بہشت سے مجھے حکمِ سفر دیا تھا کیوں
کارِ جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر (۲۲)

ندیم خدا کو دوست سمجھتے ہیں اس لیے اُس کو انتظار کرنے کو کہتے ہیں اور کبھی کبھی تو نہایت وضاحت سے عرض گزار ہوتے ہیں

نارسائی کی قسم اتنا سمجھ میں آیا
حسن جب ہاتھ نہ آیا تو خدا کہلایا (۲۳)

ابھی تک اُس کا تصور تو میرے بس میں ہے
وہ دوست ہے تو خدا کس لیے بناؤں اُسے (۲۴)

"محیط" سے "دوام" تک آتے آتے ندیم کا دوست پہ اعتماد اتنا پختہ ہوا کہ ہر چیز اسے دوست کی عطا نظر آتی ہے اس لیے اُس کے لب پہ حمد و ثنا کے غنچے چٹکتے محسوس ہوتے ہیں۔

اس مقام پر ندیم کی غزل حمد کی حدوں کو چھوتی ہوئی سماعتوں کو نور سے بھر دیتی ہے

روز اک نیا سورج ہے تری عطاؤں میں
اعتماد بڑھتا ہے صبح کی فضاؤں میں (۲۵)

مرا کوئی بھی نہیں کائنات بھر میں ندیم
اگر خدا بھی نہ ہوتا تو میں کدھر جاتا (۲۶)

نعمتوں پر شکر اور مصیبتوں پر صبر کرنا یقیناً اللہ والوں کی نشانیاں ہیں لیکن اس سے آگے کی منزل غموں کو انعام اور آزمائشوں کو اس کی رحمت خیال کرنا ہے ندیم نے اگر اس راز کو پا لیا ہے تو یقیناً وہ شکر کرنے والوں میں سے ہیں ستر سال کی عمر میں اگر ندیم یہ شعر کہہ رہا تھا وہ "تصورِ خدا" کی اعلیٰ منزل پر فائز تھا۔

مرے لیے مرے غم بھی خدا کی رحمت ہیں
یہ میری عصمتِ کردار کی ضمانت ہیں (۲۷)

خدا کو اُس کی رحمت و بندہ پروری کے آئینے میں دیکھنے والا بالآخر ایک انسان ہے اس لیے یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ وہ خدا شناسی یا خدا پرستی کی انتہا کو چھو چکا ہے تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے آس پاس پھیلی غیر یقینی اور بد عقیدگی کے درمیان خدا کی ذات کا کنول کی طرح صاف شفاف تصور رکھتا ہے اور اس پر کسی قسم کے الحاد کے چھینٹے تک نہیں پڑے اُس نے جب کہا تھا۔

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالمِ نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا (۲۸)

تو حیرت و استعجاب کی گہری کیفیت میں تھا اور جب عمر کی آٹھویں دہائی میں قدم رکھ چکا تھا تو بھی خدا شناسی کی ایک انوکھی منزل پر خود کو محسوس کرتے ہوئے کہہ رہا تھا:

شبِ فرقت میں جب نجمِ سحر بھی ڈوب جاتا ہے

اترتا ہے مرے دل میں　خدا　آہستہ آہستہ (۲۹)

خدا سے ندیم کا تعلق عمومی یا سطحی نوعیت کا نہیں اُس پر روایت کے سائے بھی ہیں اور اپنی انفرادیت بھی نکھر کر سامنے آتی ہے غالب و اقبال کے تعلق کی چھاپ بھی کہیں کہیں محسوس کی جا سکتی ہے اور بعض اوقات مکمل رنگ ندیم میں رنگے ہوئے اشعار بھی لو دیتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی انفرادیت کو اُجاگر کرتے ہوئے ناہید قاسمی نے بجا لکھا ہے:

"ندیم پر اپنی ہر منزل، اپنا ہر مقصد اور اپنا ہر راستہ واضح ہے اس لیے ندیم نے غالب اور اقبال سے بھی چند قدم آگے بڑھ کر اور اسی لیے پورے یقین کے ساتھ خدا سے بہت قریب ہو کر بات کی ہے:

خدا کے نور کو چھو کر یہ سوچتا ہوں ندیم
کہاں کہاں مجھے لائی مرے خیال کی رو" (۳۰)

خدا شناسی اور خدا پرستی کے بعد انسان دوستی کی منزل ندیم کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس حوالے سے بھی اگر ہم اُردو کی شعری روایت کا جائزہ لیں تو ندیم کی الگ حیثیت و اہمیت واضح ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں غلام محمد قاصر نے عناصرِ اربعہ کو ذہن میں رکھتے ہوئے "چوتھا عنصر" کے عنوان سے ندیم کی غزل پر جو مضمون لکھا ہے اُس میں وہ آتش و آب و باد و خاک سے میر، غالب، اقبال اور ندیم مراد لیتے ہیں۔ اُن کے خیال میں:

"غزل میں خاک (زمین) اور خاک کے پتلے (انسان) کا ذکر جس تفصیل سے احمد ندیم قاسمی کے یہاں ملتا ہے اُس کے پیشِ نظر وہی خاک کے عنصر کی نمائندگی کرتے ہیں اور ان کے لہجے کی متانت، سنجیدگی ٹھہراؤ اور وقار سے آرام کی مشابہت پوری ہو جاتی ہے" (۳۱)

حوالہ جات

۱۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۲ء، ص۲۶
۲۔ ایضاً: ص۳۲
۳۔ ندیم کی غزلیں، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۶ ص:۱۷۷
۴۔ سعد اللہ کلیم، ڈاکٹر، اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، جلد اول ص:۳۰۸۔۳۰۹
۵۔ ندیم کی غزلیں، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۶ ص:۲۴۷

۶۔ ایضاً: ص:۲۶۷
۷۔ ایضاً: ص:۵۷۷
۸۔ ایضاً: ص:۲۷۷
۹۔ ایضاً: ص:۲۸۷
۱۰۔ ایضاً: ص:۶۵۸
۱۱۔ ایضاً: ص ۶۸۷
۱۲۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ ص:۱۱۸
۱۳۔ ندیم کی غزلیں، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۶ ص:۶۹۱
۱۴۔ احمد ندیم قاسمی، میرا فنی نظریہ۔ جلال و جمال، لاہور، ص:۱۵
۱۵۔ ندیم کی غزلیں، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۶ ص:۶۴۸
۱۶۔ غلام محمد قاصر، چوتھا عنصر مشمولہ، ماہ نو، لاہور ص:۱۸۱
۱۷۔ ندیم کی غزلیں، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۶ ص:۴۰۰
۱۸۔ ندیم کی غزلیں، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۶ ص:۶۳۱
۱۹۔ ایضاً: ص:۶۱۰۰
۲۰۔ ایضاً: ص:۶۰۵
۲۱۔ ایضاً: ص:۶۰۲
۲۲۔ علامہ اقبال، کلیات اقبال، لاہور، شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۷۳ع۔ ص
۲۳۔ ندیم کی غزلیں، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۶ ص:۵۸۴
۲۴۔ ایضاً: ص:۴۸۹
۲۵۔ ایضاً: ص: ۲۵۴
۲۶۔ ایضاً: ص:۲۰۹
۲۷۔ ایضاً: ص:۷
۲۸۔ ایضاً: ص:۵۹۷
۲۹۔ ایضاً: ص:۸۰
۳۰۔ ناہید قاسمی، ڈاکٹر، ندیم کی غزلوں کا تجزیاتی مطالعہ، لاہور، سنگ میل، ۲۰۰۲ء، ص۱۸
۳۱۔ غلام محمد قاصر۔ ماہ نو، ص:۱۸۰